انیسویں صدی عیسوی میں
عربی خودنوشت سوانحی ادب کا ارتقا

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی

جدید عربی ادب کے ایک سرسری مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ اس میں خودنوشت نگاری کے فن کو ایک معقول اور مناسب مقام ملتا جارہا ہے۔ چناں چہ اس میں دن بہ دن کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے اضافہ ہورہا ہے۔ اس کی مزید وضاحت اس وقت ہوجاتی ہے جب ہم پیچھے مُڑکر اپنے قدیم سرمایے پر نظر ڈالتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد، اولاً کسی مستحکم عربی اسلامی ریاست کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے اور ثانیاً علوم وفنون سے مسلم حکم رانوں کی سرپرستی ختم ہونے کی وجہ سے تمام اسلامی ، ادبی، علمی اور تحقیقی کوششوں کا دروازہ تقریباً بند ہوگیا تھا۔ البتہ تاریخ اور سیرت جیسے موضوعات پر علماء اور حکم رانوں دونوں کی توجہ کسی حد تک باقی تھی، لیکن عربی ادب عہد زوال اور عہد عثمانی میں بالکل ٹھٹھر کر رہ گیا تھا۔ جہاں تک خودنوشت نگاری کا تعلق ہے تو یہ ادب کی انتہائی مظلوم اور متروک صنف ہوکر رہ گئی تھی۔ [۱]

نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی میں علامہ ابن خلدون کی خودنوشت 'التعریف بابن خلدون' کے بعد کوئی قابل ذکر اور مستقل بالذات خودنوشت سامنے نہیں آئی۔ اگرچہ اس دور کے تین علماء -سخاوی، سیوطی اور ابن حجر عسقلانی- نے قدیم مورخین اور سیرت نگاروں کے طرز پر اپنی تصنیف کردہ تاریخی اور سوانحی کتابوں میں اپنی زندگی کی مختصر داستان بھی قلم بند کی ہے۔ سخاوی نے اپنی کتاب 'الضوء اللامع لأہل القرن التاسع'، سیوطی نے اپنی کتاب 'حسن المحاضرۃ' اور 'طبقات المفسرین' اور ابن حجر

عسقلانی نے اپنی کتاب 'رفع الإصر عن قضاۃ مصر' کے ذیل میں ضمناً اپنے احوال کا بھی تذکرہ کیا ہے، لیکن اس تذکرہ کی کوئی ادبی اہمیت نہیں ہے۔ اس کے بعد مشہور مؤرخ ابن طولون نے اپنی کتاب 'الفلک المشحون فی أحوال محمد بن طولون' میں اور شعرانی نے اپنی کتاب 'لطائف المنن' میں کسی حد تک اپنی داستانِ زندگی بیان کی۔ سترھویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے درمیان ہمیں کوئی قابلِ ذکر خودنوشت نہیں ملتی۔ پورے عالمِ اسلام پر فکری جمود طاری تھا۔ اس کے براہِ راست اثرات ادب اور اس کے فنون پر مرتب ہوئے۔ اس پورے عرصہ میں علماء کی علمی زندگی سے متعلق بعض خفیف اشارے ملتے ہیں۔ یہ اشارے ان مؤلفین کی کتابوں کے مقدمے میں یا دوسرے سیرت نگاروں کے ذریعہ منقول شخصی اقوال کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ ان میں کتابوں، اساتذہ، اسفار اور علمی آثار سے متعلق بعض باتیں ملتی ہیں۔ عبدالرحمٰن جبرتی کی کتاب 'عجائب الآثار فی التراجم والأخبار' میں ایسے بہت سے اقوال منقول ہیں جن سے متعلقہ افراد کی ذاتی علمی زندگی کے گوشے نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ کتاب اٹھارہویں صدی کے با اثر اور ذی علم لوگوں کے حالات پر مشتمل ہے۔[۲]

انیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی مصر اور عالم عرب میں نشأۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ جمود و تعطل اور زوال و ادبار کا خاتمہ ہوا اور لوگوں میں اپنے بہتر مستقبل کی تعمیر کی فکر پیدا ہوئی۔ اس کا ایک بڑا سبب مغربی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون سے عربوں کی براہِ راست واقفیت تھی۔[۳] ۱۷۹۸ء میں مصر پر نپولین کے حملہ کے بعد اس واقفیت اور تعارف کے مواقع دن بہ دن بڑھتے چلے گئے۔ اس میں کتابوں کی درآمد و برآمد سے لے کر افراد کی آمد و رفت وغیرہ شامل تھیں۔ الغرض علمی تبادلے اور استفادے کے نتیجے میں مصر اور دوسرے عرب ممالک میں بہت سے افراد اور تحریکیں اصلاح کا علم لے کر میدان میں آگئیں۔[۴] ان میں رفاعہ طہطاوی، احمد فارس الشدیاق، جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے قوم کو سیاسیات، معاشیات اور معاشرت کے نئے اصولوں سے روشناس کیا اور اسے تعلیم، آزادی، جمہوریت، تمدن اور

تشخص کے معانی و مفاہیم اور قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ ان کی کوششوں اور سعی و جہد سے عربی قوم کے تشخص اور انفرادیت کی بقااور تحفظ کا جذبہ ابھرا اور یہ فکر ہوئی کہ مغربی تمدن کی مسلسل یلغار کی وجہ سے عربی زبان کا قدیم فکری و روحانی سرمایہ جس خطرہ سے دوچار ہے اس کا ازالہ بے حد ضروری ہے۔ چناں چہ اصلاح و بیداری کے علم بردار فی الواقع اس ضرورت کی تکمیل کے لیے بنیادی مواد اور ساز وسامان تیار کرنے میں لگ گئے۔۵ اس سلسلے میں رفاعہ طہطاوی (۱۸۰۰-۱۸۷۳ء) پہلے مصری تھے جنھوں نے قوم کو اس کے فکری وثقافتی جمود اور سیاسی ومعاشرتی زوال پر متوجہ کیا۔ انھوں نے فرانس سے واپسی کے بعد اپنی کتاب 'تخلیص الابریز' کے ذریعہ قوم کو جدید تہذیب کے مظاہر سے مطلع کیا اور ایک نئی فکری تحریک کی بنیاد ڈالی، جو مروجہ فکری اور معاشرتی مفاہیم میں ردّو بدل کی علم بردار تھی۔ ان کی کتاب اور بعد کی دوسری کوششوں کے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ خاص طور سے تعلیم اور سیاست کے میدان میں ان سے فائدہ اٹھایا گیا۔ انیسویں صدی عیسوی میں جو اہم واقعات اور تغیرات رونما ہوئے ان کے پیچھے اِن کی شخصیت کے اثرات تھے۔ ان کے ساتھ جمال الدین افغانی کی تحریک بھی اپنے شباب پر تھی۔ اس کا مقصد جدید مغربی تہذیب کے اصول ومبادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قوم کے اندر اسلام اور عربیت کی روح پھونکنا تھا۔ احمد فارس شدیاق بھی جمال الدین افغانی کے ساتھ تھے۔ شیخ محمد عبدہٗ ایک دوسری تحریک کے علم بردار تھے۔ اس کے اثرات بھی بعد میں بہت گہرے ثابت ہوئے۔ اس کا بنیادی محور یہ فکر تھی کہ تربیت کے ذریعہ ہی دینی، سیاسی اور معاشرتی اصلاح ممکن ہے۔

ان مختلف کوششوں اور تحریکوں کے نتیجے میں بہت سے نئے نئے مسائل پیدا ہوئے، جو اس وقت سے لے کر آج تک تعلیم یافتہ طبقے میں زیر بحث رہے ہیں۔ یہ مسائل سیاسی، معاشرتی، ادبی اور فکری نوعیت کے تھے۔ معاشرتی مسائل میں خاص طور سے عورت کا مسئلہ زیر بحث آیا۔۶ رفاعہ طہطاوی نے اپنی کتاب میں فرانسیسی عورت کے اخلاق و عادات پر گفتگو کے بعد عربی عورت کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ اسی

طرح شدیاق نے بھی اپنی کتاب 'الساق علی الساق' میں مشرقی اور مغربی عورت کے بارے میں اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ اس کے نزدیک عورت کو تعلیم اور معاشرتی حقوق سے بہرہ ور کرنا زیادہ ضروری ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا مسئلہ قاسم امین سے پہلے ہی زیر بحث آچکا تھا۔ اس کے علاوہ علم اور دین، ترجمہ اور اقتباس اور اسلوب اور ادب سے متعلق مسائل بھی کافی زور شور سے علمی حلقوں میں بحث کا موضوع بنے ہوئے تھے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جو خودنوشت سوانح حیات مرتب کی گئیں ان سب میں مذکورہ فکری اور اصلاحی مسائل اٹھائے گئے ہیں اور عربی معاشرے کے جمود و تعطل کو پیش کرکے اس سے نکلنے اور مغربی تہذیب سے استفادہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ رفاعہ طہطاوی کی 'تخلیص الابریز' اور علی مبارک کی 'علم الدین' اسی نوعیت کی کتابیں ہیں۔ انھیں خودنوشت کے فنّی مفہوم میں نہیں، بلکہ وسیع معنیٰ میں سوانح عمری کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح شیخ محمد عبدہٗ کی خودنوشت میں بھی دینی، معاشرتی، لسانی اور ادبی اصلاحات کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ احمد فارس شدیاق نے بھی اپنی کتابوں میں مصر اور مغربی دنیا کی معاشرتی زندگی پر نظر ڈالی ہے اور بہت سے مسائل پر اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے شدید تنقید کی ہے۔

اس زمانے کی خودنوشت سوانح عمریاں، جو فی الواقع اپنے موضوع کی ابتدائی کوششیں ہیں، مغربی اور عربی تمدن و ثقافت کے درمیان تصادم کی ٹھیک ٹھیک عکاسی کرتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ عرب اس وقت اپنی شخصیت کے بنیادی عناصر کی تلاش و جستجو اور اس کی تعمیر و تشکیل میں کس حد تک مصروف تھے۔ عربی زبان میں جدید خودنوشت سوانح نگاری کا فن ابھی پورے طور پر ارتقا پذیر نہیں ہوسکا تھا، اس لیے یہ خودنوشت سوانح عمریاں فن کے تمام تقاضوں کی تکمیل نہیں کررہی ہیں، لیکن بہرحال انھیں صحیح سمت میں مناسب قدم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ فی الواقع بعد کی تبدیلیوں کے لیے انھوں نے ایک مستحکم بنیاد فراہم کی۔ یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ باوجود اس کے کہ ان خودنوشت سوانح عمریوں کے مؤلفین مغربی تہذیب اور ادب سے واقف تھے، لیکن انھوں

نے اپنی سوانح نگاری میں اس کا بہت کم اثر قبول کیا۔ ان سب نے اپنا تعلق عربی ادب کے قدیم ورثے سے جوڑے رکھا اور اپنی تصنیفات میں قدیم اور موروثی طرز نگارش اختیار کرنے کو پسند کیا۔ چنانچہ سابقین کی طرح یہ لوگ بھی اپنے علمی وفکری ارتقاء کا عرب پس منظر، بچپن سے لے کر خودنوشت کی تالیف تک کے حالات کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اگر کبھی خاندان اور دوسرے امور کا تذکرہ نہ بھی ہوتو یہ فی الجملہ قدیم عرب علماء کے طرز نگارش سے مختلف نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ہمارے سامنے شیخ محمد عباد طنطاوی (۱۸۱۰-۱۸۶۱ء)، علی مبارک (۱۸۲۴-۱۸۹۲ء) اور شیخ محمد عبدہٗ (۱۸۴۹-۱۹۰۵ء) کی خودنوشت سوانح حیات ہیں۔ ان لوگوں نے خالص قدیم اور موروثی طرز نگارش اختیار کیا۔ ان کے علاوہ احمد فارس شدیاق، رفاعہ طہطاوی اور علی مبارک نے اپنی سوانح عمریوں میں مغربی ادب اور ثقافت سے معمولی اخذ واستفادہ کیا، لیکن اس کے باوجود انھوں نے موروثی عربی اسلوب، جو مقامات کے اسلوب سے بڑی حد تک متأثر تھا، اپنائے رکھا اور اسے نظر انداز کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ گویا اس طرح انیسویں صدی عیسوی میں اسلوب کے اعتبار سے عربی خودنوشت نگار دو حصوں میں تقسیم تھے۔ ایک قدیم اسلوب کے حامل تھے اور دوسرے قدیم کے ساتھ کسی قدر جدیدیت بھی لیے ہوئے تھے۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا اہم تاریخ ساز شخصیتوں، ان کی مختصر خدمات اور ان کی خودنوشت سوانح عمریوں کا مختصر تعارف پیش کردیا جائے۔ یہاں ان کے دینی پہلو سے زیادہ ان کی ادبی حیثیت ہمارے پیش نظر ہے۔

۱- شیخ محمد عباد الطنطاوی (۱۸۱۰-۱۸۶۱ء):

شیخ طنطاوی کی وفات اور تدفین روس میں ہوئی۔ وہ وہاں پٹرس برگ یونی ورسٹی میں استاذ تھے۔ انھوں نے اپنے احوال اپنے قلم سے لکھ کر مشہور مستشرق فرین کو اس وقت حوالہ کیے تھے جب وہ مصر سے روس منتقل ہوئے تھے۔ یہ تحریر کراتشکوفسکی کی تصنیف 'حیاۃ الشیخ محمد عباد الطنطاوی' میں شامل ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے خاندان، آباء و

اجداد، تعلیم کی ابتداء، مختلف تعلیمی مراحل، جامعہ ازہر کا زمانۂ طالب علمی، دوران تعلیم پڑھی گئی اہم کتابیں، جامعہ ازہر کے مختلف اساتذہ، تعلیم سے فراغت کے بعد مصر میں متعدد مصروفیات، دیگر اساتذہ اور رفقاء وغیرہ کا مختصر لیکن جامع تذکرہ کیا ہے۔ ۷؎ اس خودنوشت سوانح حیات سے سب سے اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں مصر کے مختلف مدرسوں کا کیا حال تھا؟ اور جامعۂ ازہر میں تعلیم و تدریس کا نصاب اور طریقۂ کار کیا تھا؟ مثلاً انھوں نے بیان کیا ہے کہ ''انھوں نے جامعۂ ازہر میں مقاماتِ حریری اور معلقات کی شرح زوزنی پڑھی تھی اور ان سے پہلے انھیں کسی نے نہیں پڑھا تھا''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ازہر میں ادب اور شاعری کی کتابیں پہلے سے پڑھائی جاتی تھی۔ جدید عربی ادب کے بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ شیخ محمد عبدہٗ کے اہتمام سے ازہر میں مقامات بدیع الزماں، نہج البلاغۃ اور بلاغت کی بعض دوسری کتابیں داخل نصاب کی گئیں۔ ۸؎ شیخ طنطاوی کے مذکورہ بیان سے ان مؤرخوں کے خیالات کی تردید ہوتی ہے۔

۱۸۴۰ء میں شیخ طنطاوی روس چلے گئے۔ وہاں وہ اپنی علمی خدمات کی بنا پر حلقۂ استشراق میں کافی مقبول ہوئے۔ انھوں نے اپنی کوششوں سے طلبہ میں عربی ادب کا ذوق پیدا کیا۔ ان کے اس کارنامے کا اثر روس ہی نہیں پورے یورپ پر پڑا۔ کیونکہ اس سے پہلے مستشرقین عربی ادب سے واقفیت کے بغیر اسلام اور مسلمانوں کا مطالعہ کرتے تھے، جس کی وجہ سے بہت سے امور و مسائل میں غلطیوں کا ارتکاب کر بیٹھتے تھے۔ شیخ کے اثرات کی وجہ سے مستشرقین میں عربی مآخذ سے براہ راست استفادہ کا رجحان عام اور مقبول ہوا۔ روس کا سفر کرنے سے پہلے مصر ہی میں ان کے تعلقات بعض یورپین اشخاص سے بہت گہرے ہوگئے تھے اور ان میں سے کچھ نے ان سے استفادہ کیا تھا۔ ۹؎

۲- شیخ محمد عبدہٗ (۱۸۴۹-۱۹۰۵ء):

شیخ محمد عبدہٗ نے اپنی زندگی کے آغاز اور علمی سرگرمیوں پر دیگر علماء کی طرح

روشنی ڈالی ہے، لیکن یہ ان کی زندگی کی مکمل سوانح نہیں ہے۔ اس میں زندگی کے ابتدائی مراحل کا قدرے تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔۱۰ شیخ نے شروع ہی میں اپنی کتاب کی تالیف کا سبب اور محرک بیان کر دیا ہے۔ ایک طرف ان کے بعض مغربی ساتھیوں کا اصرار تھا، جو ان کے تجربات و مشاہدات کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے اور یہ خواہش رکھتے تھے کہ یہ تجربات ان کی زبان میں منتقل کر دیے جائیں۔ دوسری طرف ان کے شاگرد رشید رضا کی شدید خواہش تھی کہ شیخ اگر موجودہ نسل کے لیے نہیں تو آئندہ نسل کے لیے کچھ احوالِ زیست قلم بند کر دیں۔۱۱

اس کتاب میں شیخ محمد عبدہٗ نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ مصر کے ایک اوسط درجے کے گھرانے میں پیدائش اور پرورش کے باوجود انھوں نے اپنی تلاش و جستجو اور علم و معرفت کی بنیاد پر دو بڑے کارنامے انجام دیے۔ ۱- اندھی تقلید سے نکل کر اسلاف کے طرز پر آزادانہ فکر و نظر کی دعوت۔ ۲- عربی زبان کو مسجّع اور مقفّٰی بنانے کے بجائے آسان اور عام فہم بنانے کی کوشش۔ اس وقت حکومت کے شعبوں اور اخبارات میں ناقابلِ فہم کلمات کا استعمال ہوتا تھا اور ازہر کے فارغین اور ادباء ایسے مسجّع اسالیب اختیار کرتے تھے جو معنٰی و مفہوم کی ترسیل سے قاصر تھے۔۱۲ اس کے علاوہ شیخ نے مصریوں کو ان کے حقوق سے روشناس کرانے اور اس مقصد میں حاصل شدہ کامیابیوں اور ناکامیوں کا مکمل تعارف پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنی بیش تر صفات اور خوبیوں کا مرجع اپنے والدین کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ ان کے بیان کے مطابق انھوں نے اپنے والد سے کم گوئی، وقار، سنجیدگی اور شرافت، اسی طرح والدہ سے رحم و مروت جیسی اخلاقی خوبیاں بہ طور وراثت پائی ہیں۔۱۳ اپنے حسب و نسب اور معاشرے کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرنے کے بعد انھوں نے اپنے تعلیمی مراحل تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انھیں شروع میں تعلیم سے بہت زیادہ دل چسپی نہیں تھی، وہ اس سے بھاگتے تھے، لیکن یکا یک ان کی ملاقات ان کے ایک صوفی مزاج رشتہ دار سے ہوگئی۔ اس بزرگ نے انتہائی دانائی اور حکمت سے ان کے اندر علم کا شوق پیدا کیا اور تحصیل علم کے راستوں کی

طرف رہ نمائی کی، جس کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ لہو ولعب سے کنارہ کشی اختیار کی جائے اور علم کی کلید یعنی قرآن مجید سے تعلق مضبوط کیا جائے، چنانچہ انھوں نے اس پر عمل کیا۔ اس کا بے حد اثر اور فائدہ ہوا۔ انھوں نے مختلف مکاتب اور جامعۂ ازہر کے اساتذہ کے علاوہ دوسرے اساتذہ اور ماہرین علم وفن سے بھی استفادہ کیا، جن میں شیخ جمال الدین افغانیؒ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ خود مذکورہ صوفی بزرگ سے بھی برابر استفادہ جاری رہا۔[۱۴] اس طرح انھوں نے فلسفہ، کلام اور ریاضی (یہ علوم جامعہ ازہر میں ممنوع تھے) کی تحصیل شیخ جمال الدین افغانیؒ سے کی اور اخلاق، نفسیات، معاشرت، تاریخ، فلسفہ اور تربیت کے بہت سے علوم مغربی علماء کی تحریروں سے استفادہ کرکے حاصل کیے۔ اس کے لیے انھوں نے فرانسیسی زبان بھی استفادے کی حد تک سیکھ لی۔ دورِ حاضر کی علمی ضروریات کے پیش نظر وہ مسلم علماء اور مصلحین کے لیے یورپ کی کسی زبان میں مہارت حاصل کرنا ضروری قرار دیتے تھے۔ تحصیل علم کے بعد انھیں جامعۂ ازہر میں، وہاں کے شیوخ کی مخالفت کے باوجود، درس وتدریس کے لیے منتخب کرلیا گیا۔[۱۵]

عبدہٗ کی خودنوشت کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ دورِ حاضر کے ایک عظیم مفکر کو علم ومعرفت کی راہ میں کس قدر مشقت برداشت کرنی پڑی اور ایک مستحکم فکر، رائے اور نظریہ قائم کرنے، نیز اسے لوگوں کے سامنے پیش کرنے میں کن کن مراحل سے گزرنا پڑا۔ اس خودنوشت میں مصنف کا ادبی اسلوب بہت نمایاں ہے۔ وہ ترسیلی اسلوب کے زبردست داعی تھے۔ ان کی خود نوشت قدیم عرب علماء کی خودنوشتوں سے بڑی حد تک ملتی جلتی ہے کہ اس میں پیدائش اور نشو ونما وغیرہ کا تذکرہ بالکل اُن ہی کے انداز میں کیا گیا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ قدماء کے یہاں واقعات کا تذکرہ اور تاریخی حقائق کا بیان اس انداز میں ہوتا ہے کہ اس میں ادبی اسلوب مفقود ہوتا ہے اور یہاں ادبیت کارفرما ہوتی ہے۔ اس طرح گویا وہ قدیم علماء سے مطابقت کے باوجود اپنی ایک علاحدہ اور امتیازی شناخت قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔

۳- رفاعہ طہطاوی (۱۸۰۱-۱۸۷۲ء)

یہ ازہر کے تعلیم یافتہ اور طہطا کے باشندے تھے۔ محمد علی کی توجہ اور خواہش سے جو وفود بیرونِ ملک مختلف مقاصد کے تحت بھیجے جاتے تھے ان ہی میں سے ایک وفد کے مذہبی امور کا انچارج بنا کر انھیں فرانس بھیجا گیا۔[۱۶] وہاں سے واپسی کے بعد انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات اور افکار و خیالات کا خلاصہ تحریر کیا اور اسے 'تخلیص الابریز فی تلخیص باریز' نامی کتاب کی شکل میں پیش کیا۔ طہطاوی فرانسیسی تہذیب و تمدن اور اس کے عملی مظاہر سے بے حد متاثر تھے، اس وجہ سے ان کی خواہش تھی کہ اس تہذیب کی کچھ جھلکیاں پیش کر کے وہ اپنے ہم وطنوں کو اس کی اتباع اور تقلید کی دعوت دیں۔ اس اعتبار سے یہ ایک مفید اور بامقصد کتاب قرار پاتی ہے۔[۱۷]

اس کتاب میں مقدمہ اور چار ابواب کے علاوہ کچھ تنقیدی مقالات بھی ہیں۔ مجموعی طور سے یہ کتاب فرانسیسی زندگی کے بارے میں دل چسپ معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس میں مصریوں کے عقلی و فکری نہج اور اس کے ارتقائی مراحل کی داستان بھی آ گئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رفاعہ طہطاوی اس فکری ارتقاء کی ایک اہم کڑی تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں اپنی شخصیت، حسب و نسب، خاندان اور شہر کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی ہیں، پھر فوج میں اپنی خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے فرانس کے سفر کے محرکات اور اسباب کا تذکرہ کیا ہے۔ اس بات کو خاص طور سے پیش کیا ہے کہ سفر سے قبل ہی بعض قدر دانوں اور خاص طور سے شیخ حسن عطار کی طرف سے رودادِ سفر لکھنے کا مطالبہ تھا۔ وہ عجائبات عالم سے واقفیت کے بے حد شوقین تھے، لیکن اتفاق سے صرف سفر ہی نہیں، بلکہ سفر کے نتائج، اغراض و مقاصد اور فرانس کے علوم و فنون پر ایک جامع کتاب مرتب ہوگئی۔

اس کتاب میں مصنف کے ذاتی احساسات، تاثرات اور قلبی کیفیات کا تذکرہ بے حد مختصر ہے، البتہ سفر کے واقعات و مشاہدات اور فرانسیسی عادات و اطوار وغیرہ پر

تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ان میں زمانی ترتیب کا خیال کم رکھا گیا ہے۔کتاب میں فکری پہلوادبی پہلو پر غالب آ گیا ہے،اس وجہ سے یہ ایک خشک کتاب ہوگئی ہے۔مغربی زندگی سے متعلق کسی مشرقی آدمی کی یہ پہلی تاثراتی کاوش ہے۔اس میں فوجی زندگی کے اہم عناصر اور اس کی اہم خوبیاں، مثلاً علم، فکر، دستور، سیاست، اجتماع، جمہوریت اور آزادیٔ نسواں وغیرہ ابھر کر سامنے آ گئی ہیں۔کتاب میں اس ضرورت کا احساس بھی دلایا گیا ہے کہ مشرق میں یہ خوبیاں اپنے حقیقی مفہوم میں اب تک ناپید ہیں۔

رفاعہ،علی مبارک اور شدیاق کو اپنے بیرونی اسفار کی تدوین کا موقعہ ملا۔انھوں نے اپنے سفرناموں میں ذاتی امور پر گفتگو کے ساتھ مغربی زندگی اور ادب کی تصویر بھی کھینچی ہے، کیوں کہ یہ لوگ مغربی ادب اور ثقافت سے نہ صرف یہ کہ واقف تھے، بلکہ اس سے مرعوب اور متاثر بھی تھے۔لیکن مغربی تہذیب کی عکاسی اور ترجمانی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ انھوں نے اپنے ماضی سے اپنا تعلق بالکل منقطع کرلیا ہو۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ زندگی کے آخری لمحات تک ان کا طرز تحریر وتعبیر بڑی حد تک موروثی یا روایتی رہا۔قدیم اسلوب میں جدید مضامین کا ادا کرنا ایک مشکل کام ہے۔اس وجہ سے ان لوگوں کو کبھی کبھی پریشانیوں سے بھی دوچار ہونا پڑا، خاص طور سے بعض نئے الفاظ اور مصطلحات کی ادائی میں۔اس بنا پر ان کی کتابیں عربیت اور مغربیت کے مابین ایک سنگم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں دونوں کے درمیان تال میل اور یگانگت پیدا کرنے کی بہترین کوششیں کی گئی ہیں۔رفاعہ طہطاوی کے یہاں یہ وصف اور زیادہ نمایاں ہے۔

۴-احمد فارس الشدیاق (۱۸۰۴-۱۸۸۷ء)

یہ لبنان کے ایک عیسائی خانوادے کا فرزند تھا، جو تعلیم وتعلم کے بعد تلاش معاش اور مزید تحصیل علم کے لیے مصر آیا اور پھر مختلف مقاصد کے تحت عرب، افریقہ اور یورپ کے کئی ممالک کا سفر کرنے کے بعد تیونس میں حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔اس نے اپنی کتاب 'الساق علی الساق فیما ہو الفاریاق' میں اپنی زندگی اور اس کے اہم تجربات و

واقعات پیش کیے ہیں۔ کتاب کا آغاز اس نے لبنان کے ایک گاؤں 'عشقوت' میں اپنی پیدائش کے تذکرے سے کیا ہے اور اختتام ۱۸۵۵ء یعنی زمانۂ تالیف کتاب تک کے حالات و واقعات پر ہوتا ہے۔ اس میں مصنف کی شخصیت اپنے معاصر خودنوشت نگاروں علی مبارک اور رفاعہ طہطاوی کے بالمقابل زیادہ نمایاں اور واضح ہے۔ انھوں نے مالٹہ، انگلستان اور فرانس کی سفری داستانوں کو اس مقصد کے لیے پیش کیا ہے کہ اپنے خیالات و افکار کی روشنی میں مغرب و مشرق کی رسوم و بدعات پر یکساں طور سے تنقید کرسکیں۔ ۱۸

باوجود اس کے کہ شدیاق کو فصیح عربی زبان پر عبور حاصل تھا اور وہ سجع وقوافی اور صنائع لفظی سے بہت دور رہتے تھے، لیکن اس کتاب میں اپنی زبان دانی کے زعم میں انھوں نے جابجا مترادف الفاظ اور استطرادات کا استعمال کیا ہے، جس سے ان کی کتاب میں وہ شیریں افسانوی اندازِ تحریر مفقود ہوگیا ہے جو ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس طرح اگرچہ وہ جدید ادب اور نثر نگاری کو نیا رخ دینے والوں میں پیش پیش تھے، لیکن یہاں وہ مقامات حریری و ہمدانی کے اسلوب اور مزاج سے اپنے آپ کو الگ نہیں کرسکے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے خالص تقلیدی راہ اختیار کرلی تھی۔ دراصل انھوں نے اس میں بھی ایک طرح کا لطف و مزاح پیدا کردیا تھا، چنانچہ ایک مقام پر جہاں وہ اپنی بیوی سے کسی بات چیت کا حوالہ دینا چاہتے ہیں، وہاں تخیلات اور مزعومات کے سہارے عورت کے بارے میں اپنے تمام خیالات نہایت مضحکہ خیز انداز میں پیش کرجاتے ہیں، جو غیر سنجیدگی اور عریانیت تک پہنچ جاتا ہے۔ ۱۹

شدیاق نے علی مبارک اور رفاعہ کی طرح مغربی اور مشرقی زندگیوں کی تصویر پیش کی ہے، لیکن مقصد اور شخصیت کا فرق ان میں نمایاں ہے۔ جہاں تک رفاعہ کا معاملہ ہے انھوں نے 'تخلیص الابریز' میں اپنی عقل اور فکر کا استعمال کرتے ہوئے اس دور کے فکری، سیاسی اور معاشرتی مسائل سے تعرض کیا ہے اور مختلف انسانی مشکلات کے تعلق سے مغربی علماء و مفکرین کے اقوال کو بحث و تجزیہ اور تحلیل و تبصرہ کے انداز میں پیش کیا ہے۔ اس پوری بحث میں ان کی ذات تقریباً پوشیدہ ہے، اس لیے کہ وہ اپنے شخصی تاثرات

کے بالمقابل مشاہدات اور مسموعات وغیرہ پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔اس کے علی الرغم شدیاق اپنی ذات، خیالات اور افکار میں گم رہتے ہیں۔اس لیے انھوں نے تقریباً ہر مشاہدے، رائے اور فکر میں اپنی پُرمزاح اور مضحکہ آمیز شخصیت کو اس طرح شامل کر دیا ہے کہ قاری اسے پڑھ کر بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔کہیں کہیں غیر سنجیدگی اور عبث گوئی کا مظاہرہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔اپنے وطن اور اپنے سفر کے تذکرے کے دوران عیسائی شخصیات اور مذہبی شعائر کے بارے میں ان کا اندازِ بیان تقریباً ناپسندیدہ ہے۔

شدیاق کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اپنے تجربات کے اظہار پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، گویا مشاہدات و ملاحظات میں اپنے تجربات کی آمیزش کر دیتے ہیں۔رفاعہ طہطاوی کے برعکس وہ جگہ جگہ مختلف مسائل کے تحت اپنی ذاتی رایوں کو داخل کر دیتے ہیں۔خاص طور سے انھوں نے عورت کے بارے میں بڑے طویل، مفصل اور غیر سنجیدہ مباحث چھیڑے ہیں۔وہ ان مباحث کے لیے موقع ومحل کی مناسبت وغیرہ کا سرے سے خیال نہیں رکھتے، بس عورت کا لفظ آجانا ان کے لیے کافی ہوتا ہے۔ایک موقع پر انھوں نے مصری عورت کی شب زفاف کی جو تصویر کشی کی ہے وہ حد سے زیادہ شرم ناک ہے۔

مترادفات کی کثرت اور عورت کے سراپا کی تصویر کشی میں مبالغہ آرائی پر تعجب اور حیرت اس وقت نمایاں طور سے کم ہو جاتی ہے جب شدیاق کی یہ وضاحت سامنے آتی ہے کہ اس کتاب کا مقصد زبان کے عجائبات کو پیش کرنا اور عورت کی خامیوں اور خوبیوں کو نمایاں کرنا ہے۔پہلے مقصد کے لیے انھوں نے زبان کے مترادفات کا استعمال کیا اور ان کے معانی ومفاہیم کی وضاحت کی۔[۲۰] اور دوسرے مقصد کے لیے عورت کی دیگر خوبیوں کے ساتھ اس کے حسن و جمال اور جذبات و احساسات کی تصویر کشی کی۔[۲۱] اس طرح یہ کتاب 'تعلیم لغت' کا ایک عظیم مقصد بھی لیے ہوئے ہے۔مقصد خواہ کتنا ہی بلند ہو، لیکن اس کے حصول کے لیے غلط طریقے اختیار کرنا مناسب نہیں ہے۔غیر سنجیدگی اور مزاح سے احتراز کیا جا سکتا تھا، لیکن یہ ان کی فطرت کا ایک لازمی حصہ تھا، جو تا حیات ان سے وابستہ رہا۔

اس کتاب کے غیر سنجیدہ اور مزاحیہ عنصر پر جس قدر چاہے نکیر کی جائے، لیکن اس سے اس کی ادبی اور لغوی حیثیت مجروح نہیں ہوتی۔ شدیاق اس پہلو سے جدید مصر میں عربی ادب کے معمار تھے اور انھوں نے ادب ولغت کی اصلاح وترقی میں نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ یہ ان کی اور ان کے بعض معاصرین کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بیسویں صدی میں عربی ادب اپنی پوری شان کے ساتھ ترقی یافتہ زبانوں کے بالمقابل کھڑا ہوسکا اور اس نے دور جدید کی علمی ضرورت کو انتہائی خوش اسلوبی اور فراخ دلی سے پورا کیا۔

بہر حال یہ کتاب عصر حاضر کی سب سے پہلی باضابطہ خودنوشت سوانح عمری تصور کی جاتی ہے، جو مؤلف کے ہر مرحلۂ زندگی کی سچی اور حقیقی تصویر پیش کرتی ہے۔[۲۲]

۵-علی مبارک (۱۸۲۴-۱۸۹۲ء)

علی مبارک کا تعلق مصر کے شمال مشرق میں واقع ایک گاؤں سے تھا۔ ان کا خاندان اس گاؤں میں مذہبی امور کی انجام دہی پر مامور تھا۔ مختلف اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے امتیازی نمبروں کی بنیاد پر انھیں فرانس جانے والے طلبہ کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ۱۸۴۴ء میں فرانس بھیج دیا گیا۔ فرانسیسی زبان نہ جاننے کی وجہ سے انھیں ابتدا میں خاصی زحمتیں اٹھانی پڑیں، لیکن انتھک محنت اور لگن کی وجہ سے بہت جلد انھوں نے اس مشکل پر قابو پالیا۔ چودہ سال فرانس میں گزارنے کے بعد جب وہ مصر لوٹے تو اپنی تمام تر صلاحیتوں کو قوم کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کردیا۔ تعلیم کے میدان میں ان کی خدمات خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے مغربی اور مشرقی معاشرت، دونوں کے امتیازی گوشے، دونوں کے بارے میں اپنے مخصوص خیالات اور دونوں کی روشنی میں قوم کی ترقی کے امکانات اور ذرائع پر کم از کم دو کتابیں تصنیف کیں: ۱-الخطط التوفیقیۃ، ۲-علم الدین۔ پہلی کتاب مفصل، باضابطہ اور بامقصد خودنوشت سمجھی جاتی ہے، جب کہ دوسری کتاب مکالمے اور گفتگو کے انداز میں فکر کے ایک

خاص پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ اس میں مذکور دونوں کردار فرضی اور تخیلاتی ہیں، لیکن ان کے خیالات مفید، کارآمد اور بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہیں۔ پہلی کتاب قدماء کے طرز نگارش سے زیادہ قریب ہے اور دوسری کتاب کسی حد تک جدید اسلوب اور مزاج کی نمائندگی کرتی ہے۔ گویا پہلی شیخ محمد عبدہٗ اور شیخ محمد عباد طنطاوی کی تحریروں سے مماثلت رکھتی ہے، جب کہ دوسری رفاعہ طہطاوی اور احمد فارس شدیاق کے اسلوب نگارش سے قریب تر ہے۔۲۲ ذیل میں دونوں کتابوں کا تعارف کرایا جاتا ہے:

۱- **الخطط التوفیقیة:** علی مبارک نے یہ کتاب اپنی وفات سے چار سال قبل ۱۸۸۹ء میں مکمل کر لی تھی۔ یہ ایک مفصل خودنوشت سوانح حیات ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی پیدائش، والدین، گاؤں، خاندان، مکتب کی ابتدائی و ثانوی تعلیم، اس زمانے کے مکاتب کا حال، تعلیم کے لیے فرانس کا سفر، واپسی اور اس کے بعد مصر میں اپنی مصروفیات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔۲۴ انھوں نے خودنوشت نگاری کے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر جگہ صداقت اور صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ اپنی کم زوریوں کے اعتراف میں انھیں کوئی جھجھک نہیں ہوتی، مثلاً تعلیمی مراحل کے بارے میں ان کا یہ اعتراف بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ ہمیشہ کم زور اور بھگیڑ و طالب علم رہے۔۲۵ حالاں کہ بڑے لوگ بالعموم بچپن ہی سے اپنی علمی استعداد اور مہارت کا سکہ بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں زیادہ تر فخر و مباہات کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ انھوں نے فرانس سے واپسی کے بعد اپنے گھر لوٹنے اور فرانسیسی فوجی لباس میں ہونے کی وجہ سے والدہ کے نہ پہچاننے کا ذکر بڑے دل چسپ انداز میں کیا ہے۔۲۶ انھوں نے مصر واپس لوٹ کر جو مختلف ذمہ داریاں انجام دیں ان کا اور خاص طور سے اپنی تعلیمی کوششوں کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب جدید مصر میں تعلیم کے تاریخی ارتقاء کی ایک دستاویز بن گئی ہے۔ تعلیم کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دینے کی وجہ سے انھیں 'ابو التعلیم فی مصر' کا لقب دیا گیا۔ تعلیم کے سلسلے میں ان کی نمایاں خدمات میں فوجی اسکول کی تنظیم نو، حساب، ریاضی اور انجینیرنگ کے پیچیدہ مسائل پر غور و فکر اور خدیو اسماعیل کے عہد میں مصر کے تعلیمی نظام کی

اصلاح و تربیت کی کوشش خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے ادب اور لغت کی بہترین تعلیم کے لیے مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی اور اپنے تعلیمی افکار سے عوام کو واقف کرانے کے لیے ایک مجلّہ 'روضۃ المدارس المصریۃ' کا اجراء کیا اور تعلیمی ضروریات کے تحت مناسب کتابوں کی اشاعت کے لیے 'دارالکتب' کے نام سے ایک مطبع کی بھی بنا ڈالی۔ ان کوششوں کا تعلیمی بیداری پر بڑا مفید اثر مرتب ہوا۔ فی الواقع یہ کوششیں آئندہ کی ثقافتی ترقیوں کے لیے مضبوط بنیاد ثابت ہوئیں۔ ۲۷

اس کتاب کا اسلوب مرسل ہے۔ اس میں سجع اور تکلف نہیں ہے، البتہ اکثر مقامات پر بے ربطی اور اضطراب پایا جاتا ہے، جس کے باعث تحریر کی سلاست اور حلاوت متاثر ہوئی ہے۔ چوں کہ اس کتاب میں اعداد و شمار، تاریخ اور بعض دوسری تفصیلات کثرت سے موجود ہیں، اس لیے یہ ادبی سے زیادہ تاریخی اہمیت کی حامل بن گئی ہے۔ اس کے ہر صفحہ سے علی مبارک کی خاک ساری اور انکسار کا اظہار ہوتا ہے۔ بعض مواقع پر ان کا انداز پیش کش بے حد مؤثر اور جاذب نظر ہے۔ مثلاً فرانس سے طویل وقفے کے بعد واپسی پر انھوں نے اپنی ماں کے جذبات کی جس خوب صورت انداز اور دل کش الفاظ میں تصویر کشی کی ہے، وہ سحر بیانی اور حقیقت نگاری کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ۲۸

علی مبارک نرم مزاج اور خاموش طبیعت کے مالک تھے۔ وہ معاملات کو شور و شغب اور بغاوت سے کچلنے کے بجائے احتیاط، نرمی اور حکمت سے حل کرنا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ عرابی پاشا کے انقلاب کے مخالف تھے اور اسے حکومت کے خلاف بغاوت تصور کرتے تھے، جس کا حاصل ان کی نظر میں انتشار اور انارکی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

۲-علم الدین : علی مبارک نے اپنی اس کتاب میں بدلتے ہوئے حالات کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے بحر و بر کے عجائبات اور غیر مانوس مخلوقات کی تصویر کشی کے لیے ایک فرضی مصری عالم اور ایک انگریز کے درمیان مکالمہ کرایا ہے۔ ان دونوں کی بحث و گفتگو اور سوال و جواب کے ذریعہ مشرق و مغرب کے احوال تقابلی

انداز میں سامنے آ گئے ہیں۔ گویا رفاعہ طہطاوی کی طرح علی مبارک بھی اپنے ہم وطنوں کو مغرب کے احوال اور مغربی تہذیب و تمدن کے مفید ثمرات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں، تاکہ مشرق و مغرب کے مابین فکری اور معاشرتی پہلوؤں پر اظہار خیال اور ایک دوسرے سے اخذ و استفادہ کی راہیں آسان ہوں۔ ۲۹

کتاب میں علم الدین کو ایک ازہری شیخ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، جنھیں ایک انگریز کے ساتھ یورپ کی سیاحت کا موقع فراہم کیا گیا۔ وہ مغرب کی ہر چیز کو دیکھ کر مبہوت ہو جاتے ہیں اور اس کی حقیقت جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی وہ اپنے انگریز دوست کی وضاحت سے مغربی طور و طریق پر اطمینان اور پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں تو کبھی مشرقی اقدار کا مخالف قرار دے کر انھیں رد کر دیتے ہیں۔ اس طرح مصنف مشرق و مغرب کے ردّ و قبول کے پیمانے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ اس میں دونوں طبائع اور جبلّتوں کا اسی انداز میں مقابلہ اور مقارنہ کیا گیا ہے، جیسا کہ محمد مویلحی نے اپنی کتاب 'حدیث عیسیٰ بن ہشام' میں کیا ہے۔ دونوں میں بڑی حد تک مطابقت ہے، البتہ مویلحی نے مغربی زندگی کو مزید واضح کر کے پیش کیا ہے۔ ان کا اسلوب بھی مغربی سے قریب ہے، لیکن وہ مغرب کی تقلید میں حد سے زیادہ احتیاط کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں ماضی سے رشتہ قائم رکھنا از حد ضروری اور لازم ہے۔

اس کتاب میں 'علم الدین' کی شخصیت اگرچہ فرضی ہے، لیکن مؤلف کی شخصیت سے بے حد متشابہ اور قریب ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک فرضی کردار کے پردے میں اپنی شخصیت اور اپنے افکار کی ترجمانی کی ہے۔ چنانچہ والد صاحب کا 'علم الدین' کو جامعہ ازہر بھیجنا، وہاں ایک انگریز سے بلا قصد و ارادہ اچانک ملاقات ہو جانا اور دونوں کا سفر پر آمادہ ہو جانا، ان سب میں مؤلف کی تصویر نظر آتی ہے، خاص طور سے علم الدین میں مکالمات کے دوران جو معلومات اور افکار پیش کیے گئے ہیں ان کا مرجع زیادہ تر فرانسیسی مآخذ ہیں۔ علی مبارک فرانسیسی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ ان کی شخصیت سے مناسبت اور ہم آہنگی کی وجہ سے اس کتاب کو بھی ہم ان کی ایک خود نوشت تسلیم کر سکتے ہیں۔

حواشی ومراجع

۱۔ روزنتال،علم التاریخ عندالمسلمین،ص ب-ج

۲۔ شوقی ضیف، الترجمۃ الشخصیۃ،ص۱۲-۱۰۴

۳۔ عبدالکریم الاشتر، النثر المہجری، دارصادر بیروت، ۱۹۹۰ء

۴۔ انیس المقدسی، الاتجاہات الأدبیۃ، دارالعلم للملایین، بیروت، ۱۹۸۸ء،ص۳۶۷-۳۸۰

۵۔ حوالہ سابق،ص۱۰۱-۱۰۶

۶۔ حوالہ سابق،ص۲۵۲

۷۔ کراتشکوفسکی، حیاۃ الشیخ محمد عباد الطنطاوی، ترجمہ کلثوم عودۃ، قاہرہ، ۱۹۶۴ء، ص۱۱۱-۱۱۳

۸۔ حوالہ سابق،ص۱۱۲

۹۔ حوالہ سابق،ص۱۱۲

۱۰۔ سید رشید رضا، تاریخ الاستاذ الامام، مطبعۃ المنار قاہرۃ، ۱۹۳۱ء، جلد اول،ص۹، ۳۸، ۱۰۲-۱۰۵

۱۱۔ حوالہ سابق،ص۹-۱۰

۱۲۔ حوالہ سابق،ص۱۱-۱۲

۱۳۔ حوالہ سابق،ص۱۳-۱۴

۱۴۔ حوالہ سابق،ص۱۶-۲۳

۱۵۔ حوالہ سابق،ص۲۰۱-۲۰۵

۱۶۔ جمال الدین الشیال، التاریخ والمؤرخون فی مصر، لجنۃ التالیف، القاہرۃ، ۱۹۵۸ء، ص۵۴-۵۹

۱۷۔ رفاعہ طہطاوی، تخلیص الابریز فی تلخیص باریز، وزارۃ الثقافۃ والارشاد، قاہرہ، ۱۹۵۸ء،ص۵۶-۵۷

۱۸۔ احمد فارس الشدیاق، الساق علی الساق فیما ہوالفاریاق،طبع باریس،ص۶۰-۶۱

۱۹۔ حوالہ سابق،ص۴۴۶-۴۵۱

۲۰ حوالہ سابق، ص ۱
۲۱ حوالہ سابق، ص ۱۷
۲۲ محمد احمد خلف اللہ، احمد فارس الشدیق و آثارہ اللغویۃ، ص ۹
۲۳ التاریخ والمؤرخون فی مصر، ص ۹۹-۱۱۲
۲۴ علی مبارک، الخطط التوفیقیۃ، المطبعۃ الامیریۃ، بولاق، ۱۳۰۵ھ، ص ۳۸-۴۰
۲۵ حوالہ سابق، ص ۴۱
۲۶ حوالہ سابق، ص ۴۲-۴۳
۲۷ حوالہ سابق، ص ۵۱-۵۲
۲۸ حوالہ سابق، ص ۵۷-۵۸
۲۹ علی مبارک، علم الدین، طبع قاہرہ، مصر، ۱۸۸۳ء، جلد اول، ص ۸

☆☆☆

معرکۂ اسلام و جاہلیت

مولانا صدرالدین اصلاحی

اسلام کی بصیرت افروز آگہی کے لیے جاہلیت سے واقفیت ناگزیر ہے۔
☆عقائد، عبادت، اخلاقیات اور زندگی کے تمام معاملات میں جاہلیت اور اسلام کے درمیان اصولی فرق کیا ہے؟
☆دونوں کے درمیان فطری اور مسلسل کش مکش کا انداز کیا ہے؟
☆جاہل عناصر کس طرح اسلامی تصورات میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں؟
ان اہم پہلوؤں پر اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مصنف کے گہر بار قلم نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ صفحات: ۲۱۶ قیمت:-/۸۵ روپئے
اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر اسرار احمد خان نے انتہائی معیاری اور دلکش اسلوب میں Islamic Civilization in its Real Prespective کے نام سے کیا ہے۔
آفسیٹ کی عمدہ طباعت صفحات: ۱۳۷ قیمت:-/۹۰ روپئے

ملنے کے پتے: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر-۹۳، علی گڑھ-۲
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵